پاکستان میں تعلیم کا تاریخی پس منظر
عامر ریاض

تعلیمی بندوبست کا پس منظر

سرکاری تعلیمی ادارے

انگریزوں کے دور سے قبل ہمارے ہاں سرکار از خود تعلیمی ادارے کھولنے سے گریز کرتی تھی۔ تعلیمی بندوبست کے لیے ''مدد المعاش'' یعنی گرانٹیں ضرور دی جاتی تھیں تاہم سرکاری تعلیمی ادارے نہ ہونے کے برابر تھے۔ پٹ شالائیں، مدارس، گردوارے، خانقاہیں، گھریلو سکول اور غیر مذہبی بنیاد پر چلنے والے تعلیمی ادارے تھے کہ جن میں ہندو، مسلمان، مسیحی، سکھ اور بدھ مت وغیرہ کے پیروکار پڑھتے تھے[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کے زیادہ تر مراکز خانقاہوں ہی سے جڑے ہوئے تھے تاہم یہ بندوبست 18ویں صدی میں اصلاح پسندوں کے ہاتھوں اور 19ویں صدی کے پہلے نصف کے بعد ''سرکار انگلشیہ'' کے ہاتھوں تیزی سے بدلنا شروع ہوا۔ 18ویں صدی میں برطانوی پارلیمنٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کو تعلیم میں سرمایہ کاری کے حوالے سے زور دیتی رہی تاہم کمپنی کے کارپرداز ''فتوحات'' میں رُجھے رہے۔ 1813ء میں جب برطانوی پارلیمنٹ نے چارٹر ایکٹ پاس کیا تو نہ صرف کمپنی سے مالیاتی طاقت واپس لے لی بلکہ تعلیم کے حوالے سے کام نہ کرنے پر اس کی سرزنش بھی کی۔ 1823ء تک آتے آتے برطانوی پارلیمنٹ نے کافی حد تک معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور اسی سال پبلک انسٹرکشن کا محکمہ بنا ڈالا۔ پنجاب کا معاملہ ذرا مختلف تھا کہ ابھی پنجاب برطانوی تسلط میں نہیں آیا تھا اور کمپنی بہادر پنجاب سرکار کو گرانے کے لیے ''جہاد'' سمیت تمام حربے استعمال کر رہی تھی۔ تاہم انہیں کامیاب ہونے میں مزید 26 برس بے صبری سے انتظار کرنا تھا۔ یاد رہے 1799ء سے 1849ء تک کے پچاس سالوں میں پنجاب پر ''لاہور دربار'' کی حکومت رہی تھی۔ پنجاب کی سرحدیں اس دور میں کشمیر سے قبائلی علاقہ جات تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس دور میں پنجاب میں کیسا تعلیمی نظام رائج تھا اور یہاں کے شہروں اور دیہات میں کیسی تعلیم دی جا رہی تھی اس بارے مشہور انگریز عبقری جی ڈبلیو لائٹنر نے اپنی شہرہ آفاق رپورٹ نما کتاب "History of the Indeginous Education in the Punjab" میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[2]۔ اس میں نہ صرف لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے الگ الگ سکولوں کا ذکر بھی ہے بلکہ پنجابی قاعدے کا ذکر بھی موجود ہے جو دیہات کی سطح پر تمام عورتوں کو پڑھانا لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔ حوالہ کے لیے اس رپورٹ کے آخر میں ضمیمہ نمبر 1 اور 2 دیئے گئے ہیں جن میں دلّی سے لے کر پشاور تک پنجاب میں قائم سکولوں اور مذہبی تعلیمی اداروں کی تعداد کے ساتھ ساتھ ذریعہ تعلیم و رسم الخطوں بارے بھی معلومات موجود ہیں۔ یہ اعداد و شمار لائٹنر کی رپورٹ سے لیے گئے ہیں جو 1882ء میں شائع ہوئی۔ اس رپورٹ میں پنجاب میں انگریزوں کے قبضہ سے قبل کے نظام تعلیم بارے قابل غور انکشاف کیے گئے ہیں۔ بقول لائٹنر پنجاب میں شرح خواندگی کا تناسب ہندوستان

سے کہیں زیادہ تھا*۔ خواندہ لوگوں میں ہندو، مسلمان اور سکھ بھی شامل تھے۔ 1849ء سے قبل جن علاقوں پر انگریز کا قبضہ تھا وہاں تعلیمی ادارے تو بننے لگے تھے مگر تعلیم بارے بنیادی فیصلے ابھی ہونا باقی تھے۔ ایسا ہی اک فیصلہ 1835ء میں تجویز کیا گیا تھا کہ جب لارڈ میکالے نے اپنی تقریر کی۔ قائداعظم محمد علی جناح کی ڈھاکہ میں کی گئی تقریروں[3] (مارچ 1948) کی طرح لارڈ میکالے کی اس تقریر کو بھی ان کے حمایتیوں اور مخالفین نے من مرضی سے خوب اچھالا کہ جس کی وجہ سے بعدازاں بہت سے تاریخی مغالطوں نے جنم لیا۔ لارڈ میکالے نے تقریر کے اندر جن بنیادی سوالات پر اپنی رائے دی وہ یہ تھے[4]۔

1- تعلیم کو مذہب کے پھیلاؤ کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ ایسے مسیحی اداروں کی مالی اعانت ختم کر دی جائے جو یہاں کے باشندوں کو مسیحی کرنے کے درپے ہیں۔

2- سرکاری زبان فارسی سے بدل کر انگریزی کر دی جائے۔

3- نصاب میں جدیدیت اور سائنس کی تعلیم دی جائے۔ البتہ اس میں مغربی برتری کا تاثر پیدا کرنے کا حوالہ قابل تنقید تھا۔

میکالے کی تجاویز کو مارچ 1835ء میں تسلیم کر لیا گیا۔ اس وقت گورنر جنرل لارڈ ہنری بینٹنک تھا کہ جس نے فارسی زبان کو ختم کر کے انگریزی کو لاگو کیا تھا۔ کیونکہ ابھی تک انگریزوں کے قبضہ میں پنجاب و کشمیر نہیں آئے تھے اس لیے گورنر جنرل بنگال ہی کہتے تھے**۔ میکالے کی تقریر کی سب سے زیادہ مخالفت ان مسیحی تبلیغی اداروں کے پادریوں نے کی جن کی مالی اعانت ایسٹ انڈیا کمپنی کرتی آئی تھی۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ بعدازاں لارڈ میکالے کی مخالفت میں ہندو اور مسلم بنیاد پرست بھی مسیحی تبلیغیوں کے ہمراہ شامل ہو گئے جبکہ بعدازاں قوم پرستوں اور ترقی پسندوں نے بھی ان کی تقلید ہی کی۔ البتہ بہت سے مسیحی اداروں نے فارسی کی جگہ انگریزی زبان لاگو کرنے کی حمایت کی۔ دلچسپ تضاد یہ ہے کہ ان میں سے اکثر مسیحی تبلیغی (Missionary) ادارے خود مادری زبانوں ہی کے بل بوتے پر ہمارے ہاں مسیحیت کی تبلیغ کو عام کر پائے تھے۔ پرتگیزیوں، فرانسیسیوں، امریکیوں اور برطانویوں پر مشتمل یہی تبلیغی ادارے تھے جنہوں نے ہند سندھ میں تامل، بنگالی اور پنجابی سمیت خطہ کی بہت سی مادری زبانوں میں بائبل مقدس بھی چھاپی تھیں اور انہیں مادری زبانوں کی قدر و منزلت کا کما حقہ احساس تھا۔ تاہم جب مقابلہ انگریزی سے ہوا تو چند ایک مثالوں کو چھوڑ کر زیادہ تر نے انگریزی لاگو کرنے کی مخالفت نہ کی۔ اسے مذہب اور قوم پرستی کے بے دریغ استعمال کی ابتدائی وارداتوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے محض انگریز ہی فارسی کے خاتمہ کو ضروری نہیں گردانتے تھے بلکہ خود ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی ایسے عناصر موجود تھے جو الگ الگ وجوہات کی وجہ سے فارسی زبان اور اس سے جڑی ہوئی علمی فکری روایت کے خاتمہ کو خوش آئند سمجھتے تھے۔

اسی دوران 1823ء میں بننے والے پبلک انسٹرکشن کے محکمہ نے ترقی کی اور 1849ء تک اپنا دائرہ اثر بڑھا لیا تھا۔ 29 مارچ 1849ء کو پنجاب پر قبضہ کے بعد اس کام کو فوری طور پر پنجاب میں پھیلانے پر اتفاق ہوا۔ اس اتفاق رائے کا اظہار برطانوی پارلیمنٹ میں ہونے والی 1848ء کی تقاریر میں بھی نظر آتا ہے کہ جن میں پنجاب پر قبضہ کے حق و مخالفت میں بھرپور دلائل دیئے گئے[5]۔ جو گروہ پنجاب پر قبضہ کا مخالف تھا ان میں گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ سمیت لارنس برادران شامل تھے۔ جبکہ جو گروہ پنجاب پر قبضہ کا حمایتی تھا اس نے بعدازاں لارڈ ڈلہوزی، کو نیا گورنر جنرل بنوا کر بھیجا۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ دونوں گروہ پنجاب کو خصوصی اہمیت دینے پر نہ صرف متفق تھے بلکہ ایسا بندوبست چاہتے تھے کہ اہلِ پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد کو بھول جائیں اور انگریزوں کو ''نجات دہندہ'' سمجھنے لگیں۔ انگریزوں کو پنجاب کی جغرافیائی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔ چارلس میٹکاف وہ انگریز افسر تھا جو 1809ء میں پنجاب سرکار سے معاہدہ کرنے آیا تھا۔ اس نے پنجاب سرکار بارے جو رپورٹ لکھی اس میں یہ لکھا کہ پنجاب کے اردگرد تین بڑی طاقتیں زار روس، ایران اور سلطنت عثمانیہ موجود ہیں۔

---

* اس بات کا تذکرہ روزنامہ ڈان کے لکھاری مجید شیخ نے اپنے مضمون مطبوعہ 24-1-2010 میں بھی کیا ہے۔ اس مضمون کو عوامی جمہوری فرم شمارہ نمبر 50 ''پنجاب نمبر'' (مطبوعہ لاہور) میں چھاپا گیا ہے۔ مضمون کا ترجمہ پروفیسر ظفر علی خان نے کیا ہے۔ مضمون کو www.awamijamhoriforum.org پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

** www.wikipedia.org/lord_williambentinck

اگر زار روس کسی ایک طاقت کے ساتھ مل کر پنجاب سرکار کا ساتھ دے گا تو پھر انگریزوں کا ہندوستان میں رہنا بھی مشکل ہو جائے گا*۔ اس خدشہ سے بچنے کے لیے انگریزوں نے فرنٹیئر فارورڈ پالیسی وضع کی۔ بس 29 مارچ 1849ء کے بعد جو بھی اقدامات کیے گئے اس میں اس سوچ کو کلیدی حیثیت حاصل رہی۔ گو کہ انگریز سرکار 7 مارچ 1835ء سے لارڈ میکالے کے اصولوں کو اپنا چکی تھی مگر فرنٹیئر فارورڈ پالیسی کے علاقوں میں مذہب کے تعلیم اور دیگر شعبہ جات میں استعمال کی ممانعت نہ کی گئی۔ 1849ء میں پنجاب پر قبضہ کے بعد انگریز پورے برصغیر پر بالآخر قابض ہو گیا۔ محض ایک سال سے بھی کم عرصہ میں نئے سکول بننے لگے۔ 1850ء میں لاہور میں مشن ہائی سکول کا قیام اس کا نقطہ آغاز تھا جبکہ 1856ء میں لاہور میں ایک کالج بنانے کی منظوری دے دی گئی تھی۔

''تاریخ تعلیم ہند 1800ء تا 1965ء'' کے مصنفین نے اپنی کتاب کے صفحہ 125 پر امرتسر کے سرکاری سکول کا ذکر کیا ہے جو پنجاب پر انگریزوں کے قبضہ سے پہلے چل رہا تھا۔ اس سکول میں دیگر زبانوں کے علاوہ پنجابی کا بھی الگ شعبہ کام کر رہا تھا۔ بعد ازاں انجمن پنجاب کی کوششوں سے لاہور ہائی سکول بھی بنا اور حویلی دھیان سنگھ (چونا منڈی) میں لاہور کالج بنایا گیا۔ وٹرنری کالج، میو سکول، ایچی سن کالج، پنجاب یونیورسٹی سمیت لاتعداد تعلیمی ادارے بنے۔ تعلیم میں اس ''انقلاب'' کی دیکھا دیکھی 19ویں صدی کے آخری عشروں میں ہندوؤں کی طرف سے آریا سماجی، مسلمانوں کی طرف سے امامیہ سکول، انجمن اسلامیہ، انجمن حمایت الاسلام اور سکھوں کی طرف سے خالصہ سکول و کالج بنانے کا بھی آغاز ہو گیا۔ مذہب کی بنیاد پر ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں اور سکھوں کے الگ الگ تعلیمی ادارے بنانے کی اجازت دینا لارڈ میکالے کے فرمودات سے کھلی بغاوت تھی۔ تاہم فرنٹیئر فارورڈ پالیسی کے تحت ایسا بندوبست بنانا ضروری تھا جس میں معاشرتی سطح پر مذہبی تقسیم کو بڑھایا جائے اور قومی و ثقافتی پہچان کو پس پشت ڈالا جائے۔ ان تعلیمی اداروں کو باقاعدہ سرکاری تعلیمی ادارے نہیں کہا جا سکتا تھا۔ البتہ یہ تعلیمی ادارے اپنی اپنی مذہبی و مسلکی ترجیحات کے ساتھ ساتھ سرکاری بنیادی پالیسی سے انحراف بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس دوران غیر مذہبی بنیاد پر بھی تعلیمی ادارے بنائے گئے۔ یہ وہ دور تھا جب تعلیمی اداروں کو منفعت کے لیے استعمال کرنے کے عمل کو سخت ناپسند کیا جاتا تھا۔ تعلیم کا مقصد صرف خدمت اور انسانیت کی فلاح ہی تھا۔ یہ پالیسی 1849ء سے شروع کی گئی اور 40 برسوں میں اس نے نئے تعلیمی بندوبست کو شہروں کی حد تک استوار کر لیا۔ پنجاب بھر میں سکولوں اور اعلیٰ تعلیم کے نئے اداروں کی گنتی میں اضافہ ہونے لگا۔ 1893ء بارے لاہور کے گیزیٹر میں جی سی وائلکر نے پنجاب یونیورسٹی کے علاوہ جن نمایاں اداروں کی فہرست دی ہے وہ نقل کی جا رہی ہے۔

1893-4ء میں پنجاب کے چند نمایاں تعلیمی ادارے

1- اورینٹل کالج، لاہور
2- سینٹ سٹیفن مشن کالج، دلی
3- مشن کالج، لاہور
4- میونسپل بورڈ کالج، امرتسر
5- دیانند اینگلو ویدک کالج، لاہور**
6- سکاچ مشن کالج، سیالکوٹ

---

* سیکاف مشن لاہور میں (انگریزی) پنجاب گورنمنٹ ریکارڈ آفس۔ وکٹر جی کیرنان چھپائی 1943ء، دوبارہ طباعت نرمل پبلشر زنئی دہلی، 1987ء۔

** (پاکستان بننے کے بعد اس کا نام اسلامیہ کالج سول لائنز رکھ دیا گیا)

7- مہندرا کالج، پٹیالہ

8- ایجرٹن کالج، بہاولپور

9- لاء سکول، لاہور*

10- میڈیکل کالج، لاہور**

19ویں صدی کا آخری عشرہ ڈیورنڈ لائن کے قیام (1895) اور بلدیاتی بندوبست کے باقاعدہ اجراء سے عبارت ہے۔ 1897ء میں پنجاب میں ڈسٹرکٹ بورڈ بننے لگے تھے۔ ان کے تحت بنائے گئے تعلیمی اداروں کو عرفِ عام میں کارپوریشن یا ضلعی حکومت کے سکول کہتے ہیں۔ اگر انہیں سرکاری تعلیمی اداروں کی ابتدائی شکل کہا جائے تو ان کی عمر کوئی سو سال سے بھی کم بنتی ہے۔ 20ویں صدی کے پہلے دو عشرے ایک طرف تو تیز رفتار سیاسی اتار چڑھاؤ سے عبارت ہیں تو دوسری طرف تعلیمی بندوبست کا پھیلاؤ بھی برابر جاری رہا۔

تقسیم پنجاب و قیام صوبہ سرحد (1901)، تقسیم بنگال (1905)، پگڑی سنبھال جٹا (1907)، منٹو مارلے اصلاحات (1909)، کلکتہ سے دارالحکومت کی پنجاب کی طرف منتقلی اور دِلّی کو پنجاب سے کاٹ کر دارالحکومت بنانا (1911)، جنگ بلقان (1913)، معاہدہ لکھنؤ کی حمایت و مخالفت (1916)، پہلی جنگ عظیم (1914-1918) تحریک خلافت اور جلیانوالہ باغ (1919) جیسے واقعات انہی دو عشروں کے ہیں۔ دوسری طرف انجمنوں کے تحت سکول و کالجوں کے قیام ہی میں تیزی ہی نہ آئی بلکہ یونیورسٹی آرڈیننس (1904) کے بعد پنجاب یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج لاہور اور کنگ ایڈورڈ کالج جیسے اداروں میں بھی طلباء کا تناسب بڑھنے لگا۔ یہی وہ وقت ہے جب پنجابی مسلمانوں میں بھی انگریزی بندوبست کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کی مہم تیز ہوئی اور انہوں نے میاں فضل حسین، میاں شفیع جیسے صاحب بصیرت رہنماؤں کے ذریعے تعلیمی اداروں میں مسلمان پنجابیوں کے لیے 40 فیصد کوٹہ مقرر کروانے جیسی مہمات سر کیں۔

1913ء میں گوکھلے نے یہ تجویز پیش کی کہ برٹش انڈیا میں پرائمری تعلیم کو لڑکیوں اور لڑکوں میں لازمی قرار دیا جائے۔ تاہم ان کی تجویز انگریزوں کو اس لیے بھی پسند نہ آئی کیونکہ وہ بلقان کی جنگ کے بعد کی صورتحال میں الجھے ہوئے تھے۔ البتہ 1917ء کے سیڈلر کمیشن کی سفارشات اس لیے اہم ہیں کہ ان کے تحت پہلی دفعہ وہ تجاویز سامنے آئیں جو دیسی لوگوں کی تعلیم کے لیے اہم تھیں۔ تجاویز یہ تھیں***۔

1- سیکنڈری اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کو الگ الگ کیا جائے اور انہیں بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے ماتحت کیا جائے۔

2- انٹرمیڈیٹ کے امتحانات کو یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے ضروری قرار دیا جائے۔

3- ڈگری کورسز کو تین سالہ کیا جائے۔

4- پروفیشنل اور ووکیشنل تعلیم کے پروگرام یونیورسٹیاں شروع کریں۔

5- ذریعہ تعلیم مادری زبانوں کو بنایا جائے۔

6- انگریزی کو محض یونیورسٹی سطح پر ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے۔

7- یونیورسٹیوں کو امتحانی مراکز کی بجائے تدریسی مرکز بنایا جائے۔

ڈاکٹر ایم ای سیڈلر یونیورسٹی آف لیڈز کے وائس چانسلر تھے۔ کمیشن کے دیگر اراکین میں ڈاکٹر گروگری، سر فلپ ہارٹوگ، پروفیسر رامزے میور، اسوتوش مکرجی

---

* پاکستان بننے کے بعد اس کا نام لا کالج رکھ دیا گیا

** بعد ازاں اس کا نام کنگ ایڈورڈ کالج رکھا گیا

*** تاریخ تعلیم ہند از سید نور اللہ اور جے پی نائیک صفحہ 309 نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی۔

سکولوں کی تعداد 373 تھی۔ 1962ء تک یہ تعداد بالترتیب 2237, 21623 اور 1349 ہو چکی تھی*۔ ان اعداد و شمار کو ضمیمہ نمبر 17 میں دیکھا جا سکتا ہے۔ 1972ء سے قبل پاکستان میں سرکاری سکولوں میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہو چکا تھا اور تعلیمی بیوروکریسی بھی بڑھنے لگی تھی۔ دسمبر 1947ء میں تعلیم کا شعبہ وزارت داخلہ کا حصہ تھا[10] پھر اسے الگ وزارت بنایا گیا۔ 50 کی دہائی میں یونیورسٹیوں کو امتحانی مراکز کی بجائے تدریسی مرکز بنانے کا فیصلہ ہوا اور سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ بنے۔ ان فیصلوں کے بعد لامحالہ تعلیمی بیوروکریسی کے حجم میں اضافہ بھی ہوا۔ تاہم 1972ء میں تعلیم کو قومی تحویل میں لینے کے بعد اس میں مزید اضافہ ناگزیر تھا۔

1966ء کی حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں اس بات سے اتفاق کیا گیا کہ پاکستانی حکومت تمام پاکستانیوں کو لازمی پرائمری تعلیم دینے کا بندوبست محض سرکاری سطح پر اس لیے نہیں کر سکتی کیونکہ سرکاری سطح پر تعلیم میں سرمایہ کاری کا تناسب بہت کم ہے[11]۔ یہ وہ مطالبہ تھا جو اقوام متحدہ کے ادارے یونیسف کے نمائندوں نے پہلے دن سے حکومت پاکستان کے روبرو اُٹھایا ہوا تھا[12]۔ 1972ء کی تعلیمی پالیسی نے اس حوالے سے جست لگائی اور تمام تعلیمی اداروں (ماسوائے مدارس) کو قومیا لیا گیا[13]۔ یہ بات حیران کن تھی کہ جب حمایت الاسلام، مشنری تعلیمی اداروں وغیرہ کو بھی قومی تحویل میں لے لیا گیا تھا تو آخر مدارس کو کیوں مستثنیٰ قرار دیا گیا؟ کہیں اس کے پیچھے وہی ذہن تو کارفرما نہیں تھا جو بنگالیوں کے خطرے کے ٹلنے کے بعد باقی ماندہ پاکستان میں پاک افغان اور پاک بھارت بارڈروں پر مدارس کو استعمال کرنے کی منصوبہ بندی بنائے ہوئے تھا؟ یہ سوال کسی اور تحقیق کے لیے اٹھائے رکھتے ہیں کہ یہ بحث اس تحقیق کے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔

1972ء کی تعلیمی پالیسی کے تحت حکومت پاکستان میں یہ اعلان کر دیا کہ وہ دسویں جماعت تک تمام پاکستانیوں کو تعلیم دینے کا واحد ذمہ دار ہے۔ اس انقلابی اقدام کے لیے کتنی تیاری کی گئی تھی اس بارے کچھ نہ ہی کہنا بہتر ہے۔ بقول جسٹس حمود الرحمٰن، 1966ء تک مغربی پاکستان میں موجود تربیت یافتہ اساتذہ کی تعداد 40 فیصد سے بھی کم تھی جبکہ مشرقی پاکستان میں یہ تعداد 29 فیصد سے کم تھی[14]۔ تربیت یافتہ اساتذہ کی غیر موجودگی میں یہ بیڑہ اُٹھانا کس قدر جلدی کا اقدام تھا، اس کا احساس اس وقت تک نہیں تھا۔ قومیانے کے عمل سے ایک طرف تعلیمی بیوروکریسی کا حجم استطاعت سے تجاوز کر گیا تو دوسری طرف غیر تربیت یافتہ اساتذہ کی کھیپ بھی بھرتی کر لی گئی۔ 1972ء کی پالیسی کے بعد 1973ء کا آئین بنا۔ 1973ء کا آئین ایک بہترین دستاویز تھی۔ تعلیم کے حوالے سے 1973ء کے یونیورسٹی آرڈیننس جیسے بہت سے فیصلے قابل قدر بھی تھے۔ مگر بھٹو صاحب کے ہونہار وزیر تعلیم عبدالحفیظ پیرزادہ اس آئین کو تعلیمی پالیسی سے ہم آہنگ کرنے میں بری طرح ناکام نظر آئے۔ وہ اگر شریف کمیشن سے سُو لے لیتے تو بات بن سکتی تھی مگر انہوں نے عملاً نور خان کی تعلیمی اصلاحات کو ہی جاری رکھا۔

پاکستان اور تعلیمی اصلاحات

	پہلا دور 1947.....1964	
1-	پہلی تعلیمی کانفرنس	نومبر 1947ء
2-	دوسری تعلیمی کانفرنس	دسمبر 1951ء
3-	شریف کمیشن رپورٹ	1959ء
4-	حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ	1964-66
	دوسرا دور 1969.....2009	
5-	نئی تعلیمی پالیسی کے لیے تجاویز	جولائی 1969ء
6-	نئی تعلیمی پالیسی	مارچ 1970ء
7-	تعلیمی پالیسی	1972-78ء
8-	قومی تعلیمی پالیسی	1979ء
9-	قومی تعلیمی پالیسی	1992-98ء
10-	قومی تعلیمی پالیسی	1998-2010ء
11-	قرطاس ابیض (وسط مدتی جائزہ)	فروری 2007ء
12-	قومی تعلیمی پالیسی	2009ء

* تعلیم: مغربی پاکستان میں تعلیمی ترقی کا جائزہ: شائع کردہ شعبہ مطبوعات محکمہ اطلاعات، حکومت مغربی پاکستان لاہور

1979ء کی تعلیمی پالیسی میں تعلیم کے قومیانے کے عمل میں تطہیر کا عمل شروع ہوا مگر بوجہ کوئی باقاعدہ پالیسی نہ بنائی گئی۔ 1979ء کی تعلیمی پالیسی میں دعویٰ موجود ہے ''نجی شعبہ کو تعلیمی ادارے کھولنے کی اجازت دی جاتی ہے..... مستقبل میں کبھی کسی نجی تعلیمی ادارے کو قومیانے کا کام نہیں کیا جائے گا[15]۔'' 1972ء سے قبل چلنے والی تعلیمی انجمنوں کو تعلیم کا کام دوبارہ سونپنے کی بجائے محض منفعت پر مبنی نجی تعلیم کو فروغ دینے کی پالیسی اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ اصل مقصد تعلیم کا فروغ یا تعلیمی معیار کو بہتر کرنا نہیں بلکہ ''قومیانے'' کی پالیسی سے متاثر ہونے والوں کو فوجی سرکار کی حمایت میں اکٹھا کرنا ہے۔ نج کاری کو فروغ دینے کی پالیسی گذشتہ 31 سال سے جاری ہے مگر آج بھی سرکاری سکولوں کی تعداد مدارس یا نجی تعلیمی سکولوں کے مقابلہ میں دوگنا سے بھی زیادہ ہے۔ جبکہ سرکاری تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے طلباء کا تناسب بھی کہیں زیادہ ہے۔ 09-2008 کے سرکاری تعلیمی اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں تین کروڑ 81 لاکھ 26 ہزار 222 طالبات و طلباء تعلیمی اداروں میں پڑھتے ہیں[16]۔ ان میں سے 2 کروڑ 51 لاکھ 78 ہزار (66 فیصد) آج بھی سرکاری اداروں میں پڑھ رہے ہیں۔ پاکستان کے تعلیمی اعداد و شمار بارے ضمیمہ نمبر 15 میں تفصیل سے معلومات دی گئی ہیں۔ شریف کمیشن سے لاتعلقی اختیار کرنے کے بعد سرکاری سکولوں اور نصابی کتب کے معیار میں جو بتدریج تنزلی دیکھنے میں آ رہی تھی اس کا منطقی انجام 80 کی دہائی میں سامنے آ گیا۔ سرکاری سکولوں میں معیار تعلیم تیزی سے گرنا شروع ہوا۔ اس گرتے ہوئے معیار تعلیم کو درست کرنے کا خیال اس لیے بھی نہ آیا کہ اب اشرافیہ کے لیے وسیع پیمانے پر نجی سکول بننے لگے تھے۔ معیار تعلیم گر گیا، اساتذہ کی توقیر میں کمی واقع ہوئی، بوٹی مافیا، ٹیسٹ پیپر کلچر اور ٹیوشن کا بازار لگ گیا۔ لائق اساتذہ یا تو اسی بازار میں بہہ گئے یا پھر نجی سکولوں کی زینت بن گئے۔ جہاں تک نئی بھرتیوں کا سوال تھا تو اس بارے تو کچھ نہ ہی پوچھیں۔ جہاں اساتذہ کی تکریم بھی نہ رہے اور منفعت بھی نہ ہو وہاں ایسے اساتذہ ہی سرکاری نوکریوں کا حصہ بننے لگے جو صرف ''پکی نوکری'' چاہتے تھے۔ لائق اساتذہ کی کمی کے ساتھ ساتھ نصابی کتابوں کو ضیاالحق کی ''اسلامائزیشن'' حد درجہ متاثر کر چکی تھی۔ تادم تحریر یہ مسئلہ زیر التواء ہے اور سرکاری سکولوں کا المیہ منتظر ہے کہ کب اس طرف توجہ دی جاتی ہے۔ اگر آپ ضمیمہ نمبر 15 میں دیے گئے اعداد و شمار کا جائزہ لیں تو یہ بات سمجھ آتی ہے کہ پرائمری سے مڈل تک جاتے جاتے سوا کروڑ بچے سرکاری تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ یہ انتہائی خطرناک صورتحال ہے۔ یہ بچے اس کے بعد کیا کرتے ہیں؟ یہ صورتحال بذات خود سرکاری تعلیم کے حوالے سے بہت سے سوالات اٹھا رہی ہے جو فوری توجہ کے طالب ہیں۔

09-2008 کے تعلیمی اعداد و شمار کے مطابق تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے طلباء

پرائمری سے پہلے پڑھنے والے بچے	7628000
پرائمری کی سطح پر سکول جانے والے بچے	1,72,11,000
مڈل کی سطح پر سکول جانے والے بچے	5351000
سیکنڈری کی سطح پر سکول جانے والے بچے	2049500
انٹر یا ہائر سیکنڈری کی سطح پر سکول جانے والے بچے	10,03800

1997ء میں وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے گھوسٹ سکولوں کی مہم چلائی تھی تو 2004 کے بعد پڑھا لکھا پنجاب کے تحت 200 روپے وظیفہ کی مہم کے ذریعے والدین کو یہ ترغیب دی گئی کہ وہ اپنے بچوں کو سکول بھیجیں۔ تاہم 9-2008 کے اعداد و شمار آپ کے سامنے ہیں جن میں ''ڈراپ آؤٹ'' کا تناسب بدستور پالیسی سازوں کا منہ چڑا رہا ہے۔ ایوب خان سے ضیا اور پرویز مشرف تک تعلیمی اصلاحات کی مہموں میں سیاسی جماعتوں، عام آدمی اور سول سوسائٹی کو شامل ہی نہ کیا گیا۔ جبکہ جمہوری ادوار میں سیاسی جماعتوں کو تعلیم جیسی مقدس گائے کو چھیڑنے کا عملاً اختیار تھا ہی نہیں۔ اب اگر سیاسی و معاشرتی سطح پر تعلیم جیسے

اہم معاملہ پر سیاسی تصفیہ ہی نہ ہوگا تو اس کی حالت بھی خراب سے خراب تر ہونا لازم تھا۔ جب تک سیاسی تصفیہ کے ساتھ 20 سالہ تعلیمی ویژن نہیں بنتا یہ صورتحال بگڑتی رہے گی۔ پرائمری سے فارغ ہونے والے ان سوا کروڑ بچوں میں سے کچھ تو غیر معیاری نجی سکولوں میں داخل ہو جاتے ہوں گے مگر ان کی بڑی تعداد تو گلیوں، محلوں، پنڈوں میں ایک ایسی صورتحال کا شکار رہتی ہے جسے کوئی بھی استعمال کر سکتا ہے۔ حکومت کو اس حوالے سے فوری طور پر خصوصی پالیسی بنانی چاہیے۔

مدارس سے وابستہ تعلیمی بندوبست

انگریزوں کے آنے سے قبل تعلیمی بندوبست خانقاہوں، مندروں اور گردواروں سے جُڑا ہوا تھا۔ اگر آپ لائٹنر کی رپورٹ پڑھیں تو یہ بات با آسانی سمجھ آ جاتی ہے کہ انگریزوں سے قبل یہاں ایسے تعلیمی اداروں کی بہتات تھی جو مندروں، مسجدوں، خانقاہوں اور گردواروں سے جڑے ہوئے تھے[17]۔ یہ تعلیمی بندوبست کچھ باہر والوں کی طبع آزمائیوں اور کچھ اندرون خانہ اصلاح پسندوں کے ہاتھوں قصۂ پارینہ بنا دیا گیا۔ 19 ویں صدی میں مدارس کے بندوبست میں نمایاں تبدیلیاں دیکھی گئیں تھیں۔ ان کے نصاب میں الٰہیاتی علوم (Revealed sciences) کا سلسلہ زیادہ ہو گیا جبکہ عقلی علوم (Rational sciences) کو بتدریج پیچھے دھکیلنے کا سلسلہ دیکھا گیا[18]۔ 1813ء کے چارٹر ایکٹ کے تحت انگلستان سے آنے والی مشنری انجمنوں نے فائدہ اٹھایا اور جگہ جگہ مشن کھولے۔ تاہم 1833 کے چارٹر ایکٹ میں دیگر مشنری اداروں کو بھی اجازت دی گئی کہ جن میں نمایاں ترین امریکی اور جرمن مشنری ادارے تھے۔ پنجاب کا معاملہ ذرا مختلف تھا کہ یہاں تا حال پنجابی حکمرانوں ہی کا راج تھا۔ لارڈ میکالے نے 1935ء میں مذہب کو تعلیم کے لیے استعمال کرنے کی مخالفت کی۔ تاہم 1849ء کے بعد فرنٹیئر فارورڈ پالیسی کے تحت میکالے کے فرمودات کو من مرضی سے بدل دیا گیا۔ 1849ء کے بعد ہندوؤں، سکھوں، مسلمانوں اور مسیحیوں میں نیم مذہبی و نیم سرکاری ادارے بنانے کا آغاز ہوا۔ ان اداروں کے قیام سے مدارس اور دیسی سکولوں کی اہمیت خصوصاً شہروں اور قصبوں میں گھٹنے لگی۔ تاہم لائٹنر کا کہنا ہے کہ اگر انگریز سرکار پرانے تعلیمی بندوبست سے سُو لیتے ہوئے نیا تعلیمی بندوبست بناتی تو خطہ میں وہ مسائل پیدا نہ ہوتے جن کا بعد ازاں ہم شکار ہوئے۔ سکول سسٹم بنانے میں حکومت کی دلچسپیاں زیادہ تھیں جبکہ مدارس سمیت دیگر مقامی تعلیمی اداروں کو سب بھولتے گئے۔ 1882ء میں جب لائٹنر یہ رپورٹ لکھ رہا تھا تو ایک صاحب بصیرت عالم کی طرح اس کی آنے والے 50 سالوں پر نظر تھی۔ رفتہ رفتہ ان مدارس میں شہروں کی بجائے بالعموم دور دراز کے علاقوں سے طلباء آنے لگے جن میں غربت کی شرح انتہائی زیادہ تھی اور ان کے ماں باپ بچوں کو رہائش اور کپڑے بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ مدارس وغیرہ کا سلسلہ ان علاقوں میں چلتا رہا جہاں سرکاری سکول نہیں تھے۔ پنجاب میں تعلیم کے حوالے سے ایک اہم بات بارے بتانا بھی اہم ہے۔ لائٹنر کا استدلال تھا کہ انگریزوں کے قبضہ یعنی 1849ء سے قبل جو تعلیمی بندوبست مقامی سطح پر پنجاب میں چل رہا تھا اسے نظر انداز کرنے سے فارسی و پنجابی زبانوں کو بھی دیس نکالا دے دیا گیا۔ یوں اس کی وجہ سے پنجاب کو زبردست نقصان پہنچا۔ لائٹنر کی بات 1894ء میں درست ثابت ہوئی جب انگریزوں نے برصغیر بھر میں تعلیمی اعداد و شمار اکٹھے کیے۔ ان اعداد و شمار میں تعلیم کے حوالے سے پنجاب کا شمار یکدم ناخواندہ علاقوں میں ہونے لگا۔ لائٹنر کے بقول تو پنجاب میں خواندگی ہندوستان سے کہیں زیادہ تھی مگر 1894ء میں نئے معیارات نے پنجاب کو ناخواندہ صوبوں میں ڈال دیا۔ ہمارے ہاں بہت سے دانشور اس لیے بھی پنجاب کے حوالے سے مغالطوں کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے 1894ء کے بعد کے تعلیمی اعداد و شمار ہی دیکھے ہوتے ہیں۔ پنجاب کے پنڈوں میں تو 1921ء کے بعد میاں سر فضل حسین جیسے صاحب بصیرت رہنما نے سکول بنوا دیئے مگر ہندوستان بھر کے 4 لاکھ 90 ہزار پنڈوں میں صورتحال مخدوش ہی رہی۔ خصوصاً سرحدی علاقوں میں تو بوجہ فرنٹیئر فارورڈ پالیسی سرکاری سکول بن ہی نہ پائے۔ یوں مدارس کو بطور الگ تھلگ سلسلہ کے چلائے رکھنا وہ کم لاگت طریقہ کار تھا جو ایک طرح سے سرکار کو بھی ''وارا'' کھاتا تھا۔ شہروں اور قصبوں میں بننے والے ان مدارس میں حصول علم کے

لیے آنے والے طلباء کو تہرے مسائل کا سامنا رہا۔

1- وہ جن علاقوں سے آتے تھے ان میں غربت اور پسماندگی کی شرح زیادہ تھی۔ شہری بمقابلہ دیہاتی اور دیہاتی بمقابلہ قبائلی طرز زندگی کا فرق ان میں مختلف قسم کے ردِعمل کی آبیاری کرتا تھا۔

2- عقلی علوم کو مدارس کے نصاب سے دیس نکالا دینے کے بعد ان اداروں سے فارغ التحصیل طلباء کے لیے اسلامیات، عربی پڑھانے یا عبادت گاہ کی نوکری کے علاوہ زیادہ مواقع نہیں تھے۔ ان طلباء کو یہ نہیں بتایا گیا کہ مواقع میں کمی کی وجہ عقلی علوم سے خلاصی ہے۔ یوں قدرتی طور پر ان میں ہیجان پیدا ہونا لازمی تھا۔

3- ضمیمہ نمبر 1 اور 2 میں دلی سے پشاور تک پنجاب کے سکولوں کے جو اعداد و شمار دیئے گئے ہیں ان سے واضح طور پر یہ بات سمجھ آتی ہے کہ خانقاہوں، پٹ شالاؤں مساجد، مندروں اور گردواروں سے جڑے سکول ہی نہیں بلکہ گھریلو سکولوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ ان کو یکسر نظر انداز کرنا اک ہمالیائی غلطی کے سوا کچھ نہ تھا۔

4- جدید انگریزی سکولوں کو معاشرے میں نمایاں مقام ملنے لگا جبکہ مدارس کے وقار و عزت میں کمی آتی گئی۔

وارن ہیسٹنگز، (1732-1818) لارڈ منٹو (13-1802)، لائٹنر اور سیڈلر جیسے بہت سے انگریز عبقریوں نے اس طرف بار بار توجہ بھی دلائی مگر پر نالہ وہیں رہا۔ بالعموم 1947ء تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ بہت سے دیسی دانشوروں نے بھی مذہبی اور غیر مذہبی سکولوں کو ملانے بارے توجہ دلائی مگر ان سب کی باتیں نہ تو مدارس کے چلانے والوں کو پسند آئیں نہ ہی انگریز سرکار نے اس بارے کوئی واضح پالیسی بنائی۔ ان میں نمایاں ترین مثال حکیم اجمل خان کی ہے جنہوں نے خصوصاً طب اور بالعموم دیسی و بدیسی تعلیمی سلسلوں کے حوالے سے قابل قدر کام کیا۔ تاہم حکیم اجمل خان جیسے، بہت سے عبقریوں کو بوجہ ہم سب بھول چکے ہیں۔

1947ء کے وقت جو لوگ تعلیمی پالیسی بنا رہے تھے ان میں مدارس کو سکول سسٹم سے جوڑنے کا ویژن موجود تھا۔ حوالے کے لیے پہلی اور دوسری تعلیمی کانفرنسوں کی روداد دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کا ایک بڑا ثبوت 1953ء کا وہ منصوبہ ہے جس کے تحت مشرقی پاکستان کے مدارس کو جدید تعلیم کے بندوبست سے جوڑنے کے کام کا آغاز ہوا۔ 1953ء میں جو منصوبہ بنا اس کو ''نیو مدرسہ سکیم'' کے نام سے آج بھی بنگلہ دیش میں جانا جاتا ہے[19]۔ اس منصوبہ کے تحت حکومت پاکستان نے ان مدارس میں انگریزی، حساب اور سائنس پڑھانے کے صلہ میں طلبا و طالبات کو آٹھویں اور دسویں کے امتحانات میں بٹھانے کی قانونی راہ دریافت کی۔ 1958ء تک مشرقی پاکستان میں پانچ ہزار مدارس نے اس سکیم سے فائدہ اٹھایا[20]۔ یہ منصوبہ بغیر کسی بیرونی امداد و دباؤ کے تحت بنایا گیا تھا اور اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ پاکستان کے ابتدائی دور میں ایسے مسائل سے نمٹنے کی بصیرت موجود تھی۔ قیام پاکستان کے بعد مدارس کے بندوبست کو عام سکولوں سے جوڑنے کی بصیرت کے حوالے سے یہ ایک قابل تقلید مثال ہے جسے ہم سب نے خود بھلا دیا ہوا ہے۔

50 کی دہائی کے وسط میں سرد جنگی سیاست کے زیر اثر کمیونزم سے نمٹنے کے لیے بین الاقوامی پالیسی وضع کی گئی۔ اس پالیسی سے مدارس کو بالعموم اور مذہبی سیاسی جماعتوں کو بتدریج پنپنے کی راہ ملی۔ روسی کمیونزم کو مذہب دشمن اور سرمایہ دار امریکہ کو مذہب دوست ظاہر کرنا، وہ فلسفہ تھا جسے 50 اور 60 کی دہائیوں میں بلا امتیاز مکتبہ فکر، بہت سے مذہبی گروہوں نے اپنایا۔ جن مذہبی اداروں یا پارٹیوں نے اس بین الاقوامی منصوبہ کو نہیں اپنایا انہیں ''روسی ایجنٹ'' کہا گیا۔ حیران نہ ہوں یہ نوآبادیاتی پالیسی کا ہی ایک تسلسل تھا۔ انگریزوں نے 1849ء میں پنجاب پر قبضہ کیا تھا تو سرکاری دانشوروں کے ذریعے ایسی کتب لکھوائیں تھیں جن میں پنجابی سکھوں اور پنجابی مسلمانوں کے درمیان بداعتمادی پیدا کرنے کے لیے گمراہ کن تاریخی حقائق پھیلائے تھے۔ اس کا مقصد بھی محض اپنی حکمرانی کو دوام بخشنا تھا۔ کمیونسٹ مخالف پروپیگنڈہ سے مذہبی ذہن رکھنے والوں کو یہ تاثر دیا گیا امریکہ بہادر مذہب دوست ہے جبکہ کمیونسٹ روس مذہب اور خدا کا دشمن ہے۔

رکھنے والے اساتذہ کی شدید قلت ہے۔ اس صورتحال کو بھانپتے ہوئے ہی 60 کی دہائی کی ابتداء میں شریف کمیشن نے اساتذہ کی ترقی کے لیے مدت ملازمت کو واحد معیار قرار نہیں دیا تھا۔ اساتذہ کو اپنی قابلیت بھی بڑھانی تھی اور اس کے لیے تحقیق سمیت مختلف معیارات بنائے گئے تھے۔ شریف کمیشن کے ایسی اصلاحات کے خلاف اساتذہ کے مختلف گروہوں نے ترقی پسند اور مذہبی عناصر کے ساتھ مل کر ایوب مخالف لہر میں خوب حصہ لیا تھا۔ یحییٰ خان دور میں اس مخالفت کو نئی فوجی سرکار نے اپنے حق میں بخوبی استعمال کیا۔ نور خان رپورٹ نے شریف کمیشن کی سفارشات مسترد کر کے مدت ملازمت کو ترقی کا واحد معیار مقرر کر دیا۔ یوں مختلف شعبہ جات کے حوالے سے تربیت یافتہ اساتذہ تیار کرنے کا جامع پروگرام بنانے کی بجائے ایسا دروازہ کھول دیا گیا جس نے بعد ازاں تعلیمی معیار کی تنزلی میں اہم کردار ادا کیا۔ اسلامیات کو دسویں تک لازم کر کے اساتذہ کی ہزاروں نئی آسامیاں نکالی گئیں کہ جنہیں من پسند افراد کے ذریعے پورا کیا گیا۔ ان آسامیوں کو من مرضی سے پُر کیا گیا جس نے تعلیمی بوجھ میں اضافہ کیا۔ جب اس پالیسی پر بہت شور بلند ہوا تو مارچ 1970ء میں نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان کر دیا گیا[23]۔ یوں یحییٰ سرکار وہ واحد حکومت ہے جس نے تین سالوں میں دو تعلیمی پالیسیاں دے ڈالیں۔ تاہم اس نئی تعلیمی پالیسی نے 1969ء کی بنیادی تعلیمی سفارشات کو ''خاموش'' رہ کر جاری رکھا[24]۔ یہ وہ پس منظر ہے جو 1972ء میں بننے والی سرکار کو ورثہ میں ملا، اب بھلا وہ اس سے کتنی جان چھڑا سکتی تھی؟ اس کا اظہار ہمیں 1972ء کی تعلیمی پالیسی میں ملتا ہے کہ جس میں بغیر کسی پیشگی تیاری کے تمام تعلیمی اداروں کو تو میا نے کا اعلان کر دیا گیا۔ حیران نہ ہوں، جمہوری سرکار نے پتہ نہیں کس دباؤ کے تحت تعلیمی اداروں کو تو تو میا لیا گیا مگر مدارس کو مستثنیٰ قرار دے دیا[25]۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد بنگالی اکثریت کا ڈر باقی نہیں رہا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے ملک میں مذہبی اقلیتوں کی تعداد 27 فیصد سے گھٹ کر 5 فیصد رہ گئی تھی۔ پاکستان ٹوٹنے کا الزام غیر جمہوری رویوں پر لگانے کی بجائے یحییٰ خان کی شراب نوشی پر دھر دیا گیا۔ مطلب یہ تھا اب ''صالح'' جرنیل پاکستان کو مضبوط کرے گا۔ خود بھٹو دور میں بھی کچھ ایسے فیصلے کیے گئے جن سے مذہبی بنیاد پرستی کو جلا ملی۔ انہی میں ایک فیصلہ اہل تشیع کے لیے الگ اسلامیات کی کتاب بنانا تھا۔ یہ فیصلہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش پر 1975ء میں کیا گیا اور 1976ء میں یہ نصابی کتاب سکولوں میں لگا دی گئی[26]۔ شریف کمیشن نے یہ کہا تھا کہ ہمیں اسلامیات میں ایسا کوئی مواد نہیں پڑھانا جو کسی بھی مسلم مکتبہ فکر کے خلاف ہو۔ جمہوری حکومت نے نور خانی پالیسی کی تقلید میں خود کو شریف کمیشن کے اس ویژن سے مکمل طور پر الگ رکھا۔ ثقافتی، مذہبی و مسلکی رنگا رنگی (Diversity) کو تسلیم کرنے کا ویژن تو 1973ء کے آئین میں موجود تھا مگر بھٹو صاحب کے ہونہار وزیر تعلیم عبدالحفیظ پیرزادہ 1973ء کے اس ویژن کو تعلیمی پالیسی میں سمونے میں ناکام رہے۔ بھلا ہو نیشنل عوامی پارٹی کا کہ جنہوں نے محض 5 سیٹیں جیتنے والی JUI کے مفتی محمود کو وزیر اعلیٰ بنوا کر صوبہ سرحد میں مذہبی سیاست کو بڑھاوا دیا۔ دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس، لائل پور کا نام فیصل آباد اور کرکٹ سٹیڈیم کا نام قذافی سٹیڈیم رکھنا، احمدیوں کو آئینی ترمیم کے ذریعے غیر مسلم قرار دینا، جمعہ کی چھٹی، شراب پر پابندی جیسے فیصلوں میں بھی مذہب کا حوالہ اہم تھا جبکہ تحریک نظام مصطفیٰ میں بھی سیاسی سطح پر مذہب کی اہمیت کو چار چاند لگائے۔ اس تحریک کے دوران مدارس کے طلباء کو استعمال کرنے کے کامیاب تجربات بھی کیے گئے۔ چیف آف سٹاف جنرل ضیاء الحق نے بھٹو مخالف قوم پرستوں اور مذہبی جماعتوں کو اکٹھا کر کے کمال مہارت سے کھیل کھیلا۔ لامحالہ مدارس سے وابستہ لوگوں کو اس تمام تر سیاست کی وجہ سے اپنی اہمیت و طاقت کا احساس ہونے لگا۔ جب ''نظریاتی حاکمیت'' کے لیے ہر طرح ماحول سازگار ہو گیا تو پھر جمہوری حکومت کو بھی جولائی 1977ء میں چلتا کر دیا گیا۔ یحییٰ خان کے بعد جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا کر یحییٰ خان کے نامکمل منصوبہ کو وہیں سے شروع کیا۔

''نظریاتی حاکمیت'' کے حوالے سے 1979ء کی تعلیمی پالیسی نئی انقلابی تبدیلی کا پیغام لیے ہوئے تھی۔ اس پالیسی میں کہا گیا ''جب مقاصد بدل جاتے ہیں تو تعلیمی پالیسی کو بھی انہی خطوط پر بدلنا لازم ہے''۔ صرف یہی نہیں، یہ بھی کہا گیا ''پاکستان میں پڑھنے والا ہر طالب علم مسلم امہ کا بھی حصہ ہے..... اس سے امید رکھی جاتی ہے کہ وہ دنیا بھر میں اسلام کا پیغام پھیلائے گا..... سب سے اوّلین ترجیح یہ ہے کہ نصاب کو بدل دیا جائے..... اس بات پر بھرپور توجہ دی جائے کہ ایسے اساتذہ بھرتی کیے جائیں جو نظریاتی طور پر پکے اور مذہبی خیالات کے حامی ہوں[27]۔'' حسب روایت ضیاء الحق کے اسلام کا مطلب یہی تھا کہ کوئی ضیاء آمریت

کی مخالفت نہ کرے۔ جن اسلامی جماعتوں یا رہنماؤں نے ضیاء الحق کا ساتھ نہ دیا وہ اس کڑوے سچ کو بخوبی جانتے ہیں۔ ضیاء شاہی دور کو ''مذہب کی آڑ'' کے حوالے سے تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے۔

70 کی دہائی کے آخری سالوں میں شروع ہونے والی افغان جہاد کی پالیسی نے بہت سارے مدارس کو منفعت اور بین الاقوامی شہرت ہی نہ دی بلکہ بغیر حساب کے آنے والی رقوم نے ان کو مضبوط سیاسی کھلاڑی بھی بنا دیا۔ کچھ لوگ اسے روسی فوجوں کی افغانستان آمد کا منطقی ردِعمل بھی کہتے ہیں۔ تاہم یاد رہے کہ ضیاء الحق کی تعلیمی پالیسی تو فروری 1979ء میں منظور کی گئی تھی۔ اپریل 78ء کو افغانستان میں ''ثور انقلاب'' کے ذریعے تخت الٹایا گیا۔ اپریل 1979ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی لگایا گیا۔ اپریل 1979ء میں ایران میں اسلامی انقلاب آیا جبکہ دسمبر 1979ء کو روسی فوجوں نے افغانستان میں قدم رنجا فرمایا۔ اب اس خطہ میں سرد جنگی ماحول شجرہ منتہا پر تھا جبکہ تمام ممالک مذہب سے کھیل رہے تھے۔ ایران، افغانستان، پاکستان تو فرنٹ لائن پر تھے جبکہ امریکہ، روس، برطانیہ، جرمنی، فرانس، چین اور سعودی عرب پیچھے سے کٹھ پتلیاں چلا رہے تھے۔ اس کھیل میں مخصوص مکاتب فکر کے مدارس کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ شومئی قسمت، یہ تمام مکاتب فکر مسلم اقلیتی گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ 1989ء تک تو یہ مکاتب فکر اکٹھے جہاد کرتے رہے مگر جب ''فتح'' کا دن نزدیک آیا تو ان میں اختلافات نمایاں ہو گئے*۔ اب ان کی راہیں جدا ہو گئیں جس نے بعد ازاں مہلک اثرات ڈالے۔ جہاں بغیر حساب کتاب کے اسلحہ اور ڈالر گھومنے لگیں اور منشیات سے حاصل کردہ رقوم کو بھی ''حلال'' سمجھا جانے لگے وہاں صورتحال پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہونا لازم تھی۔ دنیا بھر سے امریکی حمایت یافتہ ''جہاد'' لڑنے کے لیے ''مجاہدین'' پاک افغان سرحد کے آر پار براجمان ہو چکے تھے۔ مختلف مکاتب فکر (فرقوں) کے نئے نئے مدارس بھی کھلنے لگے تھے۔ ایک انبوہ تھا جس میں بھانت بھانت کے گروہ موجود تھے۔ حیران نہ ہوں، ان میں وہ یورپی و امریکی بھی شامل تھے جو 1980ء سے 1987ء کے درمیان مسلمان ہوئے تھے۔ مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا سے آنے والے بہت سے مجاہدین نے تو یہاں شادیاں بھی کر لی تھیں۔ اس ماحول کو مزید خراب کرنے میں فرقہ وارانہ کاروائیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ضیاء الحق دور کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس نے تمام مسلم مکاتب فکر میں شدت پسند اور انتہا پسند عناصر کو مضبوط اور اعتدال پسند لوگوں کو پیچھے دھکیلنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ صوفیاء کی بردباری عنقا ہو گئی اور شدت پسندی نے ہر مسلم مکتبہ فکر کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ سعودی عرب اور ایران کی سرد جنگ اور عراق ایران جنگ نے پاکستان میں فرقہ وارانہ کاروائیوں کو برق رفتار کرنے میں مہمیز کا کام کیا۔ 14 اپریل 1988ء کو جنیوا معاہدے کے بعد روسی فوجیں تو وہیں چلی گئیں جہاں سے آئی تھیں مگر اپنے پیچھے ایک ''دیو'' چھوڑ گئی تھیں جسے قابو رکھنے کی زنجیریں بھی نہیں تھیں۔ اس کھیل کی وجہ سے مدارس محض ملکی یا دیسی قوت نہ رہے بلکہ افغان جہاد میں آنے والے بین الاقوامی رابطوں سے بھی مستفید ہو چکے تھے۔ اب ان میں جدید تعلیم یافتہ شدت پسند عنصر بھی شامل تھا بلکہ چند ہی سالوں میں یہ بین الاقوامی عنصر ان سب پر حاوی ہوتا گیا۔ 90 کی دہائی کے وسط میں بننے والی طالبان کی حکومت نے انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا کہ وہ پاکستان میں بھی تن تنہا حکومت بنا سکتے ہیں۔ 1979ء سے تعلیمی نصاب کو بھی ایسے ترتیب دیا گیا تھا کہ مدارس ہی نہیں بلکہ سرکاری و نجی سکولوں کے نصاب میں بھی ان کے حسب منشا مواد شامل ہو چکا تھا۔ اس نصاب سے مستفید ہونے والی نسل بلوغت کو چھو رہی تھی۔ ایسے میں ٹوٹتی بنتی جمہوری حکومتوں نے اس ''دیو'' کو اپنے اپنے انداز میں قابو کرنے کی سعی لاحاصل کی۔ مگر نہ تو یہ تعلیمی پالیسی کو چھیڑ سکیں نہ ہی مدارس کو قابو کر سکیں۔ جمہوری حکومتیں اس لیے بھی بے بس تھیں کہ روسی فوجوں کے انخلاء کے بعد امریکہ نے اس مسئلہ سے ہاتھ کھینچ کر عملاً اس ''دیو'' کو کھل کر کھیلنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اپنی حالیہ تصنیف "Descision Points" میں سابق امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے یہ اعتراف کیا ہے کہ جنیوا معاہدے کے بعد امریکہ نے جس طرح اس خطہ کو خیرباد کہا تھا اس کے خطے پر بُرے اثرات ہوئے۔ یوں پہلے طالبان اور بعد ازاں القاعدہ کو یہاں پنپنے کا موقعہ ملا[28]۔ یہ وہی خدشہ تھا جس بارے محترمہ بے نظیر بھٹو نے

* فرقہ وارانہ جنگ (انگریزی) خالد احمد آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 2011ء

1989ء میں امریکیوں کے روبرو اس ''دیو'' سے متعلق سوال اٹھایا تھا[29]۔ 1988ء سے 1999ء کے درمیان جو کھیل کھیلا گیا اس میں مدارس نے تقسیم در تقسیم اور نئے نئے گروہوں کے قیام کا منظر دیکھا۔ ڈالروں اور اقتدار کے کھیل کا یہی منطقی انجام ہوتا ہے کہ اس میں نظریہ یا نقطہ نظر کی اہمیت ثانوی رہ جاتی ہے۔ ویسے بھی شدت پسند اور انتہا پسند سیاسی بصیرتوں سے محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے میں ان کے استعمال ہونے کی گنجائش خاصی بڑھ جاتی ہے۔ یوں 90 کی دہائی میں مذہبی شدت پسندوں نے جو وطیرہ اپنایا اس نے بہت سے صاحب فہم مذہبی لوگوں کو بھی ان سے دور کر دیا۔ 1992ء کی تعلیمی پالیسی ضیاء الحق سلسلہ کے تسلسل کا اعادہ کر رہی ہے تو دوسری طرف 1998ء کی تعلیمی پالیسی اس بات کی گواہ ہے کہ یہ ''دیو'' اب پالیسی سازی پر بھی گرفت مضبوط کر چکا ہے۔ 1989ء سے 1999ء کے درمیان بننے والی جمہوری حکومتوں نے کم از کم بھارت دشمنی کے حوالے سے پالیسیوں کو نرم رکھنے کی ''ناکام'' کوششیں ضرور کیں۔ 1989ء کی بے نظیر، راجیو گاندھی ملاقات اور 1998ء میں واجپائی، نواز شریف کا معاہدہ لاہور مثبت پیش رفت تھیں مگر 40 سالہ پاک بھارت سرد جنگ کی آگ کو ''ٹھنڈا'' کرنے کے لیے جو سیاسی ''مفاہمت'' مقصود تھی وہ ابھی مفقود تھی۔ اکتوبر 1999ء کو وہی پرانا کھیل دوبارہ کھیلا گیا اور جمہوری بندوبست کو لپیٹ کر جنرل مشرف نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضہ کے لیے ضیاء الحق کی تقلید میں جنرل مشرف نے سیاستدانوں اور جمہوری طرز حکمرانی کے خلاف جتنے جھوٹ گھڑے تھے وہ سب 2010ء تک کھل کر عوام کے سامنے آ گئے۔ مذہبی شدت پسندی و انتہا پسندی کے حوالے سے یہ منظر نامہ بظاہر 9/11 کے بعد تبدیل ہونا شروع ہوا مگر ماہیتِ قلب کے بغیر۔

9/11 کیوں ہوا؟ اس کے پیچھے کیا محرکات تھے؟ اس سے قطع نظر، اہم بات یہ ہے کہ وہی امریکی اور یورپی اقوام جنہوں نے 80 کی دہائی میں مذہب کو خوب استعمال کیا تھا اب مذہبی انتہا پسندی پر بہا نگ دہل تنقید کرنے لگے۔ اب انہیں ہر برائی کی جڑ ''مدارس'' میں نظر آنے لگی۔ یوں اس نئے تال میل میں بھی مدارس کو نمایاں مقام ہی حاصل رہا مگر اب انہیں ''ہیرو'' کی بجائے ''ولن'' کا کردار تفویض کر دیا گیا۔ پہلے تو مدرسوں کے منتہم بھی گھبرا اٹھے کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا ہے۔ مگر جلد وہ سنبھل گئے کہ ''ولن'' کے کردار کے باوجود ڈالروں کی بارش تھمی نہ تھی۔ اب ہر کوئی مدارس کی کج رویوں پر بات کرنے لگا۔ ''جہاد'' کو ''اصلاح'' سے بدل تو دیا گیا مگر اسلحہ، مار دھاڑ اور ڈالروں کا کھیل ویسے ہی جاری رہا جیسے 80ء کی دہائی میں تھا۔ افغانستان اور عراق کی فتوحات کے ساتھ ساتھ ایران، لیبیا، شمالی کوریا جیسی ریاستوں کو بھی لگام دے دی گئی۔ پاکستان کو تو طالبان کی حمایت سے دور کر دیا گیا مگر اس کے عوض صوبہ سرحد کی حکومت مذہبی سیاسی جماعتوں کے اتحاد کو تفویض کر دی گئی کہ جس میں تمام اقلیتی مکاتب فکر نمایاں تھے۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کو حصہ بقدر جثہ ملا جبکہ حکومت کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اربوں ڈالر ملے۔ مگر نہ تو ضیاء الحق دور کا نصاب تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی نہ ہی مدارس کو عام سکولوں سے جوڑنے کی بات ہوئی۔ تادم تحریر ان مدارس کا نصاب سرد جنگی سیاست کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ مدارس کی اصلاح کے دعویدار یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سرکار انہیں کم لاگتی ماڈل کے طور پر ابھی تک اپنائے ہوئے ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ پاکستان میں کام کرنے والے تمام مدارس اس تال میل میں شامل نہ تھے مگر ''افغان جہاد'' کے بعد متحارب اقلیتی مسلم مکاتب فکر کے نئے نئے مدارس تیزی سے کھلنے لگے اور یوں ایسے مدارس کی تعداد بڑھنے لگی جو اس منفعت کے کھیل میں حصہ دار تھے۔ ضمیمہ نمبر 15 میں دیئے گئے اعداد و شمار کے مطابق 9-2008 میں رجسٹرڈ مدارس کی کل تعداد 12599 ہے جن میں مختلف مکاتب فکر کے 16 لاکھ 5 ہزار دو سو طلباء پڑھ رہے ہیں۔ ان 12599 مدارس میں سے 12231 مدارس نجی ملکیت میں ہیں جبکہ محض 368 مدارس سرکار کی تحویل میں چلتے ہیں۔ نجی سکولوں کے حوالے سے تو ''اتھارٹی'' بنانے کی بات ہوتی ہے مگر مدارس کے حوالے سے کون سی حکومتی اتھارٹی ہے۔ اس اتھارٹی کا کیا ویژن ہے؟ اس حوالے سے واضح پالیسی نہ ہونے کی وجہ سے سوالات کا اٹھنا اچنبھے کی بات نہیں۔

ایک توجہ طلب مسئلہ

حیران کن بات یہ ہے کہ پاکستان میں یا تو کچھ اہل علم نصاب میں تبدیلیوں کی تاریخ کو ضیاء شاہی دور سے شروع کرتے ہیں اور اگر کوئی تھوڑی سی ہمت کرتا ہے، جیسے اے ایچ نیر کی تحقیق، تو وہ 1971ء کے بعد کے حالات سے اسے جوڑتے ہیں[30]۔ غالباً ایوب مخالفت میں وہ شریف کمیشن اور حمود الرحمٰن کمیشن کی بہترین سفارشات کا ذکر نہیں کرنا چاہتے۔ شاید ان کو 1953ء کے اس تجربہ بارے علم بھی نہیں ہے جب مدارس کو عام تعلیم کے ساتھ جوڑنے کا کامیاب صوبائی تجربہ کیا گیا تھا۔ پھر غالباً ایوب ''دشمنی'' کو نبھاتے ہوئے ایوب کو رخصت کرنے والے جنرل یحییٰ خان کے دور پر بھی وہ تنقید سے بوجہ گھبراتے ہیں۔ مگر حقائق کو مدنظر رکھا جائے تو یہ یحییٰ دور کا زریں کارنامہ تھا کہ جس میں شریف کمیشن کی تعلیمی اصلاحات کو خیرباد کہہ کر پاکستان کے تعلیمی بندوبست کو طویل عرصہ کے لیے تنگ نظری کی گھاٹیوں میں دھکیل دیا گیا۔ پھر نور خان رپورٹ (1969) آئی جو ضیاء الحق کی تعلیمی پالیسی کا دیباچہ تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ کراچی مقیم لبرل ترقی پسند دانشور جعفر احمد نے اپنے تحقیقی مقالہ ''سکول، نصاب اور انسانی حقوق'' میں 1969ء کی اس پالیسی کی تعریفیں کیں ہیں[31]۔

ایک اور اہم بات جس سے بعض اہل علم پہلو تہی کرتے ہیں اس کا تعلق پاک۔ بھارت سرد جنگ سے ہے، جو 17 روزہ لڑائی کے بعد ذرائع ابلاغ، فنون لطیفہ اور تعلیم کے میدانوں میں لڑی گئی۔ اس جنگ کی وجہ سے دونوں ممالک میں تنگ نظری، انتہا پسندی کو بڑھاوا ملا اور نفرتوں پر مبنی نصابی کتب ہی نہ لکھی گئیں بلکہ دونوں ممالک میں ہندو اور مسلم انتہا پسند گروہوں کو ریاست میں اثر و رسوخ بڑھانے کے مواقع ملے۔ مشہور بھارتی سماجی تنظیم ''سہمت'' کی روح رواں محترمہ شبنم ہاشمی کے بقول ''بھارت میں بھی انتہا پسندوں اور بنیاد پرستوں کو ریاست میں اہم مقام 1968ء سے 1974ء کے درمیان حاصل ہوا اور اس مقصد کے حصول کے لیے تعلیم، فنون لطیفہ اور انفارمیشن کے محکموں کا انتخاب نمایاں ترین رہا۔ جنوبی ایشیاء میں بالعموم رواداری، بردباری اور سیاسی بصیرتوں میں کمی واقع ہوئی جبکہ بنیاد پرستی اور جنگجو آنہ و انتہا پسندانہ رویوں نے تقویت حاصل کی[32]۔''

تاہم ہمارے ہاں کچھ اہل علم اسے کبھی 1971ء کے بعد کے حالات سے جوڑتے ہیں تو کچھ ایسے بھی ''باکمال'' حضرات ہیں جو قیام پاکستان کو ہی اس انتہا پسندی کی وجہ قرار دے ڈالتے ہیں۔ غالباً ان کی نظر سے نہ تو 1947ء کی تعلیمی کانفرنس کی رپورٹ گزری ہے نہ انہیں شریف کمیشن بارے زیادہ جانکاری ہے اور نہ وہ پاک بھارت سرد جنگ کے اثرات بارے بات کرنا چاہتے ہیں۔

نجی تعلیم

یہ بات پہلے بھی ہو چکی ہے کہ ہمارے ہاں تعلیمی بندوبست کا بڑا بوجھ غیر سرکاری ادارے ہی اٹھاتے رہے ہیں۔ ان اداروں میں مشترک بات تعلیم کو منفعت کے لیے استعمال نہ کرنا تھا۔ تعلیم کو ایک خدمت سمجھنا اوّلین مسئلہ تھا۔ 50 کی دہائی کے آغاز میں مشرقی بنگال اور کراچی میں نجی سکول بننے کے سلسلہ میں تیزی دیکھی گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُردو بولنے والوں کو جب 1947ء کے بعد بڑی تعداد میں کراچی جبکہ محدود تعداد میں سکھر، حیدر آباد اکٹھا کرنا شروع کیا گیا تو وہاں سکولوں میں سندھی زبان رائج تھی۔ سندھی سے بچنے کے لیے یہاں تیزی سے نجی سکول کھولے گئے کہ صوبائی سرکار تو سندھی کے حق میں تھی[33]۔ مشرقی بنگال میں نجی سکولوں کے قیام کی وجہ محض اُردو بنگالی تنازعہ ہی نہ تھا بلکہ دیگر سیاسی و مذہبی وجوہات بھی تھیں۔ 1953ء میں طلباء نے جو تحریک کراچی میں چلائی تھی اس کے نتیجہ میں نجی سکولوں کو سرکاری مراعات و رعایتیں دینے کا راستہ نکالا گیا تھا۔ تحریک کا مطالبہ تھا کہ نجی سکولوں کی فیسیں بہت زیادہ ہیں اور سکولوں کے مالکان بہت منافع کمار ہے ہیں۔ شومئی قسمت، تحریک کے نتیجہ میں نجی سکولوں کے مالکان کو راہ راست پر لانے کی بجائے نجی سکولوں کو کہا گیا کہ طالبعلموں کی 50 فیصد فیسیں سرکار ادا کرے گی۔ تاہم ان سکولوں کو تعلیم کے معیار کے لیے کیا کرنا ہے، اس بارے کوئی بات نہ کی گئی۔ ماسوائے کراچی مغربی پاکستان میں نجی سکول 1970ء

تک نہ ہونے کے برابر تھے۔ انجمنوں یا مشنری اداروں کے سکول معقول تعداد میں چل رہے تھے جنہیں بلامنفعت (Not for Profit) کے اصول پر چلایا جاتا تھا۔ 1972ء میں ان تمام سکولوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔

1979ء سے قبل کی تمام پالیسیوں میں تعلیم کے حوالے سے یہی تکرار نظر آئے گی۔ اس میں حاوی عنصر یہی رہا کہ تعلیم کو محض منفعت کے لیے استعمال کرنا قابل قبول نہیں۔ تعلیم کو قومی تحویل میں لیتے ہوئے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اب ریاست تمام پاکستانیوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی واحد ذمہ دار ہو گی۔ ایسے میں ٹرسٹوں، انجمنوں اور مشنوں کے تحت چلنے والے غیر حکومتی فلاحی اداروں سے وابستہ تعلیمی اداروں کو بھی سرکاری تحویل میں لے لیا گیا تھا۔ تاہم ضیاء شاہی میں 1972ء سے قبل چلی آ رہی تعلیمی انجمنوں کو دوبارہ سے سرگرم عمل کرنے کی بجائے نج کاری کو پروان چڑھایا گیا۔ تعلیمی انجمنوں والے عدالتوں میں بھی گئے۔ بنیادی نقطہ یہ اٹھایا گیا کہ سرکار نے تعلیم کو قومی تحویل میں لیا تھا مگر حکومت نے ان تعلیمی اداروں سے منسلک جائیدادوں کو بھی قومی تحویل میں لے لیا ہے۔ مگر عدالتوں نے ان کے مقدمات کو لٹکائے رکھا۔ البتہ ایف سی کالج کے سلسلہ میں عدالت نے 80 کی دہائی کے آخر میں یہ فیصلہ دے دیا کہ سرکار ایف سی کالج کو چلانے والے ٹرسٹ کی دیگر جائیداد واپس کرے۔ اس فیصلہ میں 90 کی دہائی میں عمل نہ ہو سکا۔ البتہ مشرف دور میں ایف سی کالج دوبارہ چرچ کو مل گیا۔ تاہم تادم تحریر اس حوالے سے سرکاری پالیسی نہیں آئی۔ 1979ء کے بعد جنرل ضیاء الحق نے اسلامائزیشن اور نجکاری کو ایسے ساتھ ساتھ چلایا کہ چند ہی سالوں میں ملک بھر میں سینکڑوں نجی سکول کھل گئے جو درمیانے و نچلے درمیانے طبقات اور اشرافیہ کے لیے الگ الگ مخصوص تھے۔ نجی تعلیم کے حوالے سے کوئی قانون سازی نہ کی گئی بلکہ عملاً انہیں پھلنے پھولنے کے لیے کھلی چھٹی دے دی گئی۔ یہ 1979ء ہی کی پالیسی ہے کہ جس میں ضیاء الحق نے نجی سکول بنانے والوں کو ضمانت دی تھی کہ آئندہ کوئی بھی حکومت، پاکستان میں نجی سکولوں کو قومی تحویل میں نہیں لے گی[34]۔ بہت سے مذہبی گروہوں نے اس منفعت میں مال کمایا اور خود بخود نجکاری کے حمایتی بن گئے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نجکاری کی اس ''پنیر'' کو اشرافیہ نے ہضم کر لیا اور عام پاکستانیوں کے لیے ''ماٹھے'' نجی سکول ہی رہ گئے۔

2007ء میں ''تعلیمی پالیسی 1998ء کا وسط مدتی جائزہ'' کے عنوان سے بنائے گئے کمیشن نے ایک وائٹ پیپر شائع کیا۔ اس وائٹ پیپر میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ پاکستان میں تعلیم سے وابستہ نجی سیکٹر 30 فیصد تعلیم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے[35]۔ یاد رہے 1992ء کی تعلیمی پالیسی میں بھی نجی تعلیم کے حق میں فیصلہ سناتے ہوئے تعلیم سے وابستہ نجی سیکٹر کو مفت پلاٹ، ٹیکسوں میں چھوٹ اور دیگر رعائتیں دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا[36]۔ پھر انہی فیصلوں کو 1998ء کی تعلیمی پالیسی میں بھی آگے بڑھایا گیا تھا۔ تعلیم میں بڑھتے ہوئے نجی سیکٹر سے متعلق وائٹ پیپر کے اس دعویٰ کو اگر سچ مان لیا جائے تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ 30 فیصد سکول جانے والے پاکستانی بچوں کو تعلیم دینے والے ان نجی تعلیمی اداروں میں اشرافیہ کے کتنے سکول ہیں؟ 300 سے 1000 روپے ماہوار فی بچہ فیسیں لینے والے کتنے نجی سکول ہیں؟ 300 روپے ماہوار سے کم فیس لینے والے کتنے سکول ہیں؟ ان اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر پھر یہ دیکھا جائے گا کہ اگر 300 روپے ماہوار سے کم فیسیں لینے والے سکول بہت بڑی اکثریت میں ہیں تو پھر سرکاری مراعات اشرافیہ کے سکولوں کو کیوں ملتی رہی ہیں؟ مفت یا معمولی قیمت پر پلاٹ کن سکولوں کو دیئے گئے؟ حکومت نے ان مراعات کے بدلے ان نجی سکولوں کو کیا ہدایات جاری کیں؟ ان پر کتنا عمل ہوا؟ ویسے تو 1979ء کی پالیسی میں نجی سیکٹر کو تعلیم میں سرمایہ کاری کا اجازت نامہ دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ اشرافیہ کے سکول میرٹ پر 10 فیصد ایسے بچوں کو داخل کریں گے جو غریب یا نچلے متوسط طبقہ سے ہوں گے[37]۔ اس پالیسی پر نہ تو کسی نے عمل کیا اور نہ ہی کسی نے اس بارے استفسار کیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ ''خانہ پوری'' تھی جو ضیا شاہی کی خصوصی پہچان تھی۔ 1992ء اور 1998ء کی تعلیم پالیسیاں بنانے والوں نے بھی اس ''چھتے'' کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ ایسے دانشور بھی پیدا ہو گئے جو اشرافیہ کے سکول سسٹم کو بطور رول ماڈل اپنانے کے مشورے بھی دیتے ہیں۔ 2007ء کا وائٹ پیپر بھی نجی اشرافیہ کے ''مخمصہ'' سے الجھتا ہوا نظر آتا ہے۔ وائٹ پیپر کا لکھاری[38]

ایک طرف اس بات پر پریشان نظر آتا ہے کہ اشرافیہ کے ان نجی سکولوں میں پڑھنے والے نوجوانوں کو اپنی دھرتی بارے کوئی دلچسپی نہیں تو دوطری طرف اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ نجی اور سرکاری سکولوں میں فاصلوں کو کیونکر کم کیا جاسکتا ہے۔ انجمنوں کی بجائے جب تعلیم میں محض منفعت کے لیے سرمایہ کاری کی گئی تو ماڑے اور اشرفیہ کے سکولوں میں خلیج واضح ہو کر نظر آنے لگی تھی۔ یہ سب 80 کی دہائی میں ایسے وقت پر ہوا تھا جب مشرق وسطیٰ کی نوکریوں سے آنے والی رقوم اور افغان جہاد کی قانونی و غیر قانونی آمدن کے ذریعے نو دولتی پاکستانیوں کی اچھی بھلی تعداد خیبر سے کراچی تک نظر آنے لگی تھی۔ اس تال میل نے خوب رنگ جمایا اور زیادہ منافع کے لیے رہائشی علاقوں میں کوٹھیوں میں سکول کھل گئے جس نے شہری زندگی کے ہیجان کو مزید بڑھاوا دیا۔ اب ہوٹلوں کی طرح 5 سٹار سکول بننے لگے۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے چند سکولوں میں معیاری تعلیم کے لیے کامیاب کوششیں بھی کی گئیں۔ یہاں پڑھانے کے نت نئے طریقوں کو اپنایا گیا۔ مگر یہ سوال اہم ہے کہ یہ سکول ملک کے کتنے فیصد پاکستانی بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں؟ یہ دیکھنا بھی اہم ہے کہ اشرافیہ کے ان سکولوں سے نکلنے والے بچے اپنی دھرتی سے کتنی جڑت رکھتے ہیں۔ کیا انہیں کسی بھی طرح قابل تقلید مثال قرار دیا جاسکتا؟ پڑھانے کا طریقہ تو سکولوں میں اچھا ہے، ایک کلاس میں استاد اور طالب علموں کا تناسب بھی مناسب ہے مگر وہاں کیا پڑھایا جا رہا ہے یہ دیکھنا بھی اہم ہے۔ اب اگر آپ ضمیمہ نمبر 15 کا جائزہ لیں تو اس میں نجی تعلیمی اداروں کی تعداد 74693 ہے جن میں تقریباً ایک کروڑ 30 لاکھ بچے پڑھتے ہیں۔ ان بچوں کو چھ لاکھ 16 ہزار اساتذہ پڑھاتے ہیں۔ اب اگر سکولوں کی سطح پر دیکھتے ہیں تو پرائمری تعلیم کے حوالے سے صرف 17512 نجی سکول ہیں جو پاکستان میں موجود کل پرائمری سکولوں کا محض 11 فیصد بنتا ہے۔ پاکستان میں اشرافیہ کے سب سے بڑے سکول سسٹم میں پہلی سے میٹرک یا او لیول تک پڑھنے والے بچوں کی تعداد 80 ہزار سے بھی کم ہے۔ اب اگر اشرافیہ کے تمام سکول چند لاکھ بچوں کو پڑھا رہے ہیں تو نجی شعبہ میں پڑھنے والے باقی ایک کروڑ سے زائد بچے کن حالات کا شکار ہیں اس بارے کوئی دو رائے نہیں رہ جاتی۔ ضمیمہ نمبر 15 میں اساتذہ کو تربیت دینے والے اداروں کی تعداد 176 لکھی ہے۔ ان 176 میں سے صرف 28 ادارے نجی شعبہ چلا رہا ہے۔ ان 28 اداروں میں ہر سال محض ایک فیصد اساتذہ کو تربیت دی جاسکتی ہے۔ اساتذہ کی تربیت کے حوالے سے نجی شعبہ کی اس غفلت سے خود نجی تعلیم کا دبدبہ خاصا کم رہ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو پہلے دن سے پاکستان میں نجی شعبہ ایسی ہی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرتا چلا آیا ہے جو خود بہت سے سوالات کو جنم دیتا ہے۔